صحیفتہ التکوین

مصنف

محمد ناصر الملک

ہز ہائنس، مہترِ چترال

اردو ترجمہ مع نوٹس

ممتاز حسین

کچھ صاحب کتاب کے بارے میں

خاندان

محمد ناصر الملک، سابق ریاست چترال کے شاہی کے ایک حکمران تھے۔ وہ مہتر شجاع الملک کے ہاں ۱۸۹۷ میں پیدا ہوئے۔ مہتر موصوف کے پہلے فرزند ہونے کی حیثیت میں ولی عہد قرار پائے۔ ان کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی گئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انہیں اسلامیہ کالجیٹ سکول پشاور بھیجا گیا، اور پھر انہوں نے اسلامیہ کالج پشاور سے گریجویشن کیا۔ کالج کے زمانے میں وہ ایک نمایاں طالبعلم کے طور پر اُبھرے اور ہر شعبے میں ان کی کارکردی قابل رشک تھی۔ وہ کالج کی طلبہ تنظیم خیبر یونین کے صدر بھی منتحب ہوئے۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد انہوں نے سول سروس جوائن کرلی اور مختلف اضلاع میں تعینات رہے۔ اس دوران وہ ریاست کے اندر بھی بحیثیت ولی عہد اپنی ذمے داریاں نبھاتے رہے، جن میں ریاست کے سب سے اہم صوبے کی گورنری بھی شامل تھی۔ ۱۹۳۶ سے ۱۹۴۳ تک وہ ریاست کے حکمران یعنی مہتر رہے۔ تخت نشینی کے بعد انہوں نے ریاست کے نظام میں بنیادی نوعیت کی اصلاحات کا آغاز کیا ، جن کا مقصد اس کو ایک جدید ریاست بنانا تھا۔ ان میں سب سے اہم تعلیم کے فروغ کی کوششیں تھیں۔ انہوں نے حکومت سنبھالتے ہی ریاست کے طول عرض میں سکول قائم کیے۔ لیکن ان کی توجہ کا مرکز چترال کا مرکزی سکول تھا جسے وہ اپنے مادر علمی اسلامیہ کالج کے خطوط پر ترقی دینا چاہتے تھے۔

ان تمام مصروفیات کے باوجود ناصر الملک ایک بہت ہی پڑھے لکھے شخص تھے۔ ان معنوں نہیں کہ وہ گریجویٹ تھے بلکہ اس لیے کہ ان کا مطالعہ انتہائی وسیع اور متنوع تھا۔ مشرقی علوم پر ان کی دسترس تو تھی ہی لیکن انہوں نے مغرب کے علوم و فنون کو نہایت گہرائی میں جا کر پڑھا۔ وہ اپنے دور کے جدید ترین علمی رجحانات اور انکشافات پر پورا عبور رکھتے تھے۔

ان کی زیر نظر کتاب ان کے ذہن رسا اور وسعت مطالعہ کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ انہوں نے ایک انتہائی نازک مسئلے پر قلم اٹھایا، جس کی حدین ایک طرف سائنس سے ملتی ہیں تو دوسری طرف عقیدے سے۔ ڈارون کا نظریہ ارتقاء نہ صرف ہمارے ہاں بلکہ خود مغرب میں بھی ہمیشہ متنازعہ رہا ہے۔ اس کی حمایت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مسلمانوں میں سے بھی بعض لوگوں نے اسے اسلام کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ناصر الملک کی کتاب اس موضوع پر ایک نہایت ہی منفرد کوشش ہے۔ مصنف کا مختلف شعبہ ہائے علم و فن پریکسان عبور اور وسعت مطالہ اسے ایک مفید کتاب بنانے کے لیے کافی ہیں۔ کتاب فارسی زبان میں مثنوی کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس طرح اس کی ادبی اہمیت بھی بنتی ہے۔

مقصد تصنیف خود مصنف کے بقول یہ ہے کہ مسلمان طلبہ کو بالخصوص اور عام لوگوں کو بالعموم، یہ احساس دلایا جائے کہ سائنس اور حکمت، اسلام کے خلاف نہیں، بلکہ عین اس کے مطابق ہیں۔ مصنف ہماری قوم میں پائے جانے والے علم دشمن رویوں کے سخت شاکی نظر آتے ہیں اور اس کا کچھ مداوا چاہتے ہیں۔ افسوس صد افسوس کہ آٹھ دہایاں گزرنے کے باوجود ہمارے یہ رویے بجائے بہتر ہونے کے اور بھی خراب ہوگئےہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ ایک کوشش ہے، دوبارہ یاد دہانی کی، کہ ہمارے رویے شاید درست نہیں ہیں۔

تازہ خواہی داشتن گر رازہائے سینہ را گاہے گاہے باز خواں این قصہ پارینہ را

ترجمے کے سلسلے میں کوشش کی گئی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مصنف کے انداز بیان کو برقرار رکھنے کی کوشش کی جائے۔ جہاں جہاں وضاحت کی ضرورت محسوس ہوئی، یا موضوع کے بارے میں نئی دریافتوں کا ذکر مناسب سمجھا گیا، ہر باب کے اخر میں حواشی کا انتظام کیا گیا ہے۔

ممتاز حسین

تعارف

حمد وثناء کے بعد------میں اس کتاب کے بارے میں کوئی بلند بانگ دعوےٰ نہیں رکھتا۔ بلکہ مجھے تو اپنی کم مایئگی کا شدت سے احساس ہے، کہ میں نہ تو علوم دینیہ کا ماہر ہوں اور نہ ہی علوم جدیدہ و السنہ کا۔ وجہ تصنیف اس کتاب کی یوں ہوئی کہ دوران طالبعلمی مجھے مباحث ارتقا کے بارے میں جاننے کا شوق دامنگیر ہوا۔ ۱۹۲۳ میں اس موضوع پر مطالعے کے نتائج کو میں نے کچھ ابیات کی صورت میں منظوم کیا۔ تعلیم سے فراعت کے بعد قران مجید کی تلاوت کے دوران جب بھی کوئی ایسی آیت نظر سے گذری جو اس نظریے کی تایئد کرتی ہو، اسے نوٹ کرتا رہا۔ ۱۹۲۷ کے اوائل میں، جب میں عسکری تربیت[۱] کے سلسلے میں دہلی میں مقیم تھا، اس نظریے کو قدرے تفصیل سے لکھنے کا ارادہ کیا اور نتیجے میں بارہ سو ابیات پر مشتمل ایک رسالہ تیار ہوگیا۔ اسی زمانے میں کچھ دن لاہور میں گذرے تو یہ رسالہ بعض احباب اور اکابر فضلاء جیسے علامہ اقبال[۲] کو دکھانے کا موقع ملا۔ تاہم انہوں نے اسے نامکمل گردانا۔ انہی کے مشورے پر میں نے اس موضوع پر جدید ترین کتب کا حصول اور مطالعہ حال (۱۹۳۶) تک جاری رکھا۔ ۔ میری دس سالہ جستجو کا نتیجہ زیر نطر کتاب کی صورت میں اپ کے سامنے ہے۔

للہِ الحمد ہر آن چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد پسِ پردہِ تقدیر پدید

کتاب کو لکھتے ہوئے ایک بڑا مسئلہ میرے سامنے یہ پیش ہوا کہ جدید سایئنسی اصطلاحات کو فارسی کے قالب میں کس طرح ڈھالا جائے۔ اس سلسلے میں استاذِمحترم مولوی عبدالرحیم[۳] صاحب،ناظم مکتبئہ علوم شرقیہ دارالعلوم سرحد (لائیبریری اسلامیہ کالج پشاور) کی امداد اور رہنمائی میرے لیے انمول ثابت ہوئی۔ علامہ عنایت اللہ المشرقی[۴] نے اس رسالے کا بغور مطالعہ فرمایا اور مصنف کی کوشش کو بنظر استحسان

دیکھا۔ انہوں نے کئی اہم مسائل خصوصاً حیاتیات کے سلسلے میں میری رہنمائی بھی فرمائی۔

میرے بعض دوستوں کی رائے تھی کہ جدید سائنسی نظریات کی قرآن مجید کے ساتھ تطبیق بجائے خود کوئی پسندیدہ عمل نہیں،کیونکہ یہ نظریات ابھی پایہ ثبوت کو نہیں پہنچ سکی ہیں۔ ایسی صورت میں ان کی قرآنی آیات کے ساتھ تطبیق قبل از وقت ہے اور یہ ملت کے عقائد میں ضعف کا سبب بنے گا۔

حاشا و کلا- کلام پاک کسی تطبیق کا محتاج نہیں۔ اور یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک شخص مسلمان ہو اور ایک لمحے کے لیے بھی اس خیالِ فاسد کو اپنے دل میں جگہ دےدے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ حکماء، چاہے قدیم ہوں یا جدید، ہمیشہ اس امر پر نازاں رہے ہیں کہ انکے بعض نظریات قرآن سے مطابقت رکھتے ہیں۔

ما ان مدحت محمدا بمقالتی   لکن مدحت مقالتی بمحمد

لیکن اگر کوئی شخص جویائے معارف قرآنی ہے، اور فلسفہ و سائنس سے بھی شعف رکھتا ہے، تو اس میں کیا عیب ہے کہ اسے ہر دو میں مطابقت نظر آئے؟ اور یہ کہ اگر کوئی قرآنی مسئلہ بغیر تاویل کے، کسی فلسفیانہ مسئلے پر منطبق ہوتا ہے تو اس اس کو پردۂ اخفا میں رکھنے کا کیا فایدہ؟

میں نے بھی ایسی کچھ مطابقتوں کا مشاہدہ کیا ہے اور اب ان کو منظوم انداز میں پیش کر رہا ہوں۔ مقصد میرا یہ ہے کہ ہمارے طالب علم اور عامة المسلمین دونوں، بغیر کسی کراہت قلبی کے، جدید علمی نظریات کو پڑھیں اور حقایق سے تنفر کی روش کوترک کر دین ۔

ماضی اور حال میں ملت کے بعض جلیل القدر علماء نے اس قسم کی ممکنہ تطبیقات کو تلاش کیا اور ان کے اظہار کو مفید سمجھ کر ان کی اشاعت کی۔ ان میں سرسید احمد خان، مفتی محمد عبدہ[5] اور علامہ طنطاوی[6] جیسے پائے کے لوگ شامل ہیں۔

نہ من تنہا درین میخانہ مستم   جنید و شبلی و عطار ہم مست

اور اگر معترضین یوں فرمائیں

ترسم که ہمی رانی زورق به سراب اندر
زادی به حجاب اندر میری به حجاب اندر

تو جواباً عرض ہے که آمنا و صدقنا۔ حقیقت الحقائق وراءالوراء ہے اور نظر ظاہر بین سے محجوب۔ اسے ہونا بھی محجوب ہی چاہیے۔ لیکن مشاہدہ عالم مادی کے بارے یہی کہا جاسکتا ہے که

من سرمه رازی را از دیده فروشستم
اسرار جہان دیدم پنہان به کتاب اندر

اگر مسیحی عالم آلیور لاج[۷] توراۃ کی ایک آیت کی بزعم خود فلسفۂ جدید کے ساتھ تطبیق کے بعد یه اعلان کر سکتا ہے که مذہب و حکمت کی جنگ صلح میں مبدل ہو گئی ہے، تو ہم بھلا اس حق سے کیوں کر محروم رہیں۔ کیوں نه ہم بھی آیات بینات کے شواہد کا اظہار کرکے جنگ کی اس آگ کو ٹھنڈی نه کرین ، جو مذہب اور حکمت میں نجانے کب سے لگی ہوئی ہے۔

قرآن مجید تمام مسلمانوں کے اعتقاد کے مطابق اللہ تعالےٰ کا قدیم، اور قیامت تک غیر مبدل کلام ہے۔ جیسے که ارشاد ہے

انه لکتاب عزیز۔ لا یاتیه الباطل من بین یدیه ولا من خلفه تنزیل من حکیم حمید۔

اور پچھلے لوگوں سچ کہا ہے که

جمیع العلم فی القرآن لیکن تقاصر غنه افہام الرجال

کہا جاتا ہے که قرآن کی ہر آیت سات پردوں میں محجوب ہے، اور ہر پردے کے اٹھنے سے نئے معانی سامنے آتے ہیں۔ احقر کے خیال میں اگر فخر الدین رازی [۸] نے حکمت یونان کو قران میں دیکھا تو خوب کیا۔ اور اگر طنطاوی نے جدید سائنس کو قران کے اندر تلاش کیا تو کار مرعوب کیا۔ حقائق قرآنیه تو ان سب چیزوں سے بالا تر ہیں۔ لیکن قرآن کو ہم ایک

ایسا آیئنہ کہہ سکتے ہیں جس میں ہر دور کے لوگ اپنی ذہنی استعداد اور اپنے دور کی علمی استعداد کے مطابق اپنے کمال کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ اگر دنیا اور انسانی تہذیب لاکھوں سال باقی رہے اور ترقی کرتی رہے تو مادی علوم اور انکشافات اسی طرح قران کی انگلی پکڑ کر چلتی رہیں گی۔

ہست قران سربسر گفتار حق نیز عالم جملگی کردار حق
کے بود کردار و گفتار خدا ہمچو قول ما ز فعل ما جدا

حاصل یہ کہ انسانی علم کبھی بھی علم خداوندی کی برابری نہیں کر سکا ہے اور نہ کر سکے گا۔ اور اسی بناء پر کہا جاتا ہے کہ بعض قرانی اسرار قیامت تک فہم انسانی سے بالاتر ہی رہیں گے۔

وما اوتیتم من العلم الا قلیلا

تو درون غار گشتہ مبتلا مقصدت بیرون اقطار السماء

ہست قرآن ریسمانی زان طرف ار گرفتی این سرش را لا تخف

بعض حضرات نے اس کتاب کی زبان کے بارے میں اعتراض فرمایا ہے کہ اس میں ثقیل عربی الفاظ بکثرت استعمال ہوئے ہیں، حالانکہ جدید ایرانی فارسی میں یہ متروک ہیں۔ اس بارے میں عرض ہے کہ فارسی زبان صرف ایران کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ما وراء النہر کے اکثر علاقوں، نیز بدخشان اور افغانستان کی زبان بھی یہی ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوستان میں فارسی انہی علاقوں سے آئی، نہ کہ ایران سے۔ ہندوستان کی فارسی وہ لوگ اپنے ساتھ لائے تھے جو ماوراءالنہر، بدخشان اور افغانستان سے محمود غزنوی تا ظہیر الدین بابر فاتحین کے ساتھ آئے تھے۔ پس اگر میں نے ایرانی فارسی کا اتباع نہ کیا تو اس میں کیا حرج ہے۔ نیز یہ بھی عرض ہے کہ میں نے اصطلاحات عربی سے لیے ہیں نہ کہ زردشت کی ژند اوستا[9] سے۔

اس وضاحت کے باوجود بھی اگر کچھ اصطلاحات قارئین کو بہت ہی نامانوس لگیں تو اسے میری مجبوری سمجھ کر معاف فرمائیں۔

خذ ما صفا و دع ما کدر

آدمی از سہو و خطا پاک نیست
آب روان بے خس و خاشاک نیست

کتاب کی ہر فصل کا اغاز تبرکاً ایک آیت قرآنی سے کیا گیا ہے اور کتاب کے دونوں حصوں کے آخر میں ایک ایک تتمہ شامل ہے جس میں مسائل جدیدہ کی تطبیق آیات قرآنی سے کی گئی ہے۔

شد ز تائید اله العالمین   بین عقل و نقل تطبیق چنیں

محمد ناصر الملک

نوٹس

۱۔ اگرچہ ناصر الملک بنیادی طور پر سول سروس کے رکن تھے، تاہم شہزادے کی حیثیت سے انہیں انڈین آرمی میں اعزازی کمیشن دیا گیا تھا اور یہ تربیت اسی سلسلے کی تھی۔

۲۔ علامہ اقبال سے ناصر الملک بہت متاثر تھے اور جب بھی انہیں لاہور جانے کا موقع ملتا ، علامہ سے ضرور ملتے۔

۳۔ مولانا حافظ عبد الرحیم کلاچوی(۱۸۵۷-۱۹۵۰) اسلامیہ کالج پشاور کی لائیبریری کے مہتمم تھے۔ آپ اپنے زمانے کے بے بدل عالم تھے۔ خصوصاً عربی زبان و ادب میں سند مانے جاتے تھے۔ انہیں بانیِ کالج صاحبزادہ عبدالقیوم خان امرتسر سے تلاش کرکے لائے تھے تاکہ کالج میں ایک اعلیٰ معیار کا کتبخانہ قائم کرنے میں ان کی مہارتوں سے فایدہ اٹھایا جائے۔ انہوں نے اسلامیہ کالج میں پڑھایا بھی۔ لیکن کتب خانہ ان کا خصوصی میدان تھا۔ انہوں نے بہت سی اعلیٰ پائے کی تصاتیف چھوڑی ہیں۔ مولانا کا تعلق مسلک اہل حدیث سے تھے۔ شاید انہی کا اثر تھا کہ ناصر الملک کا رجحان بھی اسی طرف بتایا جاتا ہے۔

۴۔ علامہ عنایت اللہ خان المشرقی (۱۸۸۸- ۱۹۶۳): ماہر تعلیم، ریاضی دان، مفکر، انقلابی سیاسی جماعت خاکسار تحریک کے بانی۔ آپ کچھ عرصہ اسلامیہ کالج پشاور کے پرنسپل بھی رہے۔ ناصر الملک اسی زمانے میں ان کے شاگرد رہے اور فکری طور پر ان سے متاثر ہوئے۔

۵۔ مفتی محمد عبدہ (۱۸۴۹- ۱۹۰۵) مصری عالم، مصلح ۔ بنیادی طور پر جامعہ ازہر میں استاذ رہے۔ مشہور داعی انقلاب سید جمال الدین افغانی کے شاگرد تھے۔ محمد عبدہ کی فکر کی خاص بات ان کی جدیدیت پسندی ہے۔ انہوں اسلام کو جدید تہذیب سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اس کی ایسی تعبیرات کیں جو قدامت پسند حلقوں میں ناپسند کی گئیں۔

۶۔ شیخ طنطاوی جوہری متوفی ۱۹۴۱: مصر کے مشہور عالم، جنہوں نے قرآن مجید کی تفسیر جدید انداز میں لکھی۔ ان کی تفسیر میں قرآن سے جدید سائنس کو ہم آہنگ دکھایا گیا ہے۔

۷۔ سر الیور لاج Sir Oliver Lodge : انگریز سائنسدان، موجد اور مفکر (۱۸۵۱-۱۹۴۰) جس نے کئی اہم سائنسی نظریات پیش کیے۔ وہ روحانیات میں بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔

۸۔ فخر الدین رازی :فلسفی اور مفسر۔ انہوں نے تفسیر الکبیر کے نام سے قرآن مجید کی ایک تفسیر لکھی۔ اس تفسیر میں انہوں نے مروجہ فلسفیانہ اور سائنسی نظریات (جن کی بنیاد یونانی تھی)کو قرآن مجید سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔

۹۔ ژند اوستا: پارسیوں کی مقدس کتاب، جس کی زبان اب متروک ہے، جبکہ قرآن کی زبان عربیِ مبین آج بھی اسی صورت میں زندہ ہے۔